محمد حنیف ندوی

تعلیماتِ غزالی

نماز اور حضورِ قلب

توجہ الی اللہ اور قلب کی حضوری پر یوں تو بہت سے دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مگر سرِ دست اس اختصار پر قناعت فرمائیے۔ قرآن میں ہے:

اقم الصلوٰۃ لذکری

ولا تکن من الغافلین

یہاں جو غفلت سے روکا ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نماز کے باب میں یہ بمنزلہ حرام کے ہے۔

چنانچہ حدیث میں ہے:

من لم تنہہ صلاتہ عن الفحشاء والمنکر لم یزدد من اللہ الا بعداً۔ — جس شخص کی نماز اس کو فواحش اور برائیوں سے نہیں روکتی، وہ نماز پڑھنے کے باوجود کچھ اللہ تعالیٰ سے دور ہی رہتا ہے۔

اور یہ حقیقت ہے کہ غافل کی نماز میں یہ صلاحیت ہی کہاں ہے کہ برائیوں سے روک دے۔ ایسا شخص اس حدیث کا مصداق ہے:

کم من قائم حظہٗ من صلاتہ التعب والتعب۔ — کتنے ہی نماز پڑھنے والے ایسے ہیں کہ ان کا حصہ نماز میں بس اتنا ہی ہے کہ اس سے تھکن اور کوفت حاصل کرتے ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر زیادہ وضاحت سے آنحضرت نے ارشاد فرمایا ہے:

لیس للعبد من صلاتہ الا ما عقل منہا۔ — نماز کی بہرہ مندیوں سے اسی قدر لطف اندوز ہونا ممکن ہے جتنا کہ کوئی شخص اس کو سمجھتا ہے۔

اس باب میں قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ نمازی دراصل اللہ تعالےٰ سے مخاطب ہوتا ہے، اور اس کے سامنے اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کو پیش کرتا ہے۔ اب اگر دل پر لہو و غفلت کے پردے چھائے ہوئے ہیں تو خطاب و مناجات کا کیا محل ہے؟ دوسرے فرائض تو ایسے ہیں کہ ان میں حضورِ قلب اور توجہ و التفات شرط نہیں۔ جیسے زکوٰۃ کہ یہ بہرحال ادا ہو جاتی ہے۔ اگرچہ ادا کرتے وقت زکوٰۃ دینے والے کی توجہات میں یکسوئی اور حضور نہ پایا جائے۔

کیونکہ اس سے ایک تو حاجت مند کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے دوسرے نفس پر اس کی لذتیں اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہی حال روزہ اور حج کا ہے۔ کہ ان سے خواہشات کا زور کم ہوتا ہے۔ اور انسان بہر حال اللہ کی راہ میں مصائب و تکالیف کا سامنا کرتا ہے۔ مگر نماز کا یہ حال نہیں۔ اس کا معاملہ ان عبادات سے قطعی مختلف ہے۔ کیونکہ اس میں تو حضورِ قلب ہی قرأت اور ذکر ہے۔ یا رکوع و سجود اور قیام و قعود ہے۔ اور قرأت و ذکر تعبیر ہے مناجات و خطاب سے۔ صرف الفاظ و حروف کا دُھرا دینا نہیں۔ اب ایک شخص اگر اللہ تعالےٰ سے دعا مانگتا ہے اور کہتا ہے :

اھدنا الصراط المستقیم۔ پروردگار مجھے صراطِ مستقیم پر گامزن رکھ

تو سوال یہ ہے کہ غفلت و لہو کی صورت میں وہ کیا طلب کرتا ہے؟ کیا چاہتا ہے اور کیا مانگتا ہے! کیا دعا کی اس اہمیت کا اس کو احساس ہے۔ جب نماز سے مقصود ہی یہ ہے کہ ایک شخص اللہ کا ذکر کرے، اس کی حمد و ثنا میں مشغول ہو اور تضرع و الحاد سے اس سے دعائیں مانگیں۔ تو وہ شخص کیونکر نماز سے عہدہ برآ ہو سکے گا، جس کا دل افکار دنیا میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور جس کا قلب غفلت و لہو کے حجابات سے مستور ہے۔ نماز کی یہ ایسی خصوصیت ہے کہ اس کا انکار ممکن نہیں۔ رہا رکوع و سجود اور قیام و قعود تو وہ اگرچہ جسمانی حرکات سے متعلق ہیں۔ تاہم یہ حرکات بھی اس وقت تک عبادت کی شکل اختیار نہیں کر پاتیں جب تک ان کی تہ میں قصد و ارادہ اور حضورِ قلب کارفرما نہ ہو۔ نماز کا یہی وہ امتیاز ہے کہ جس کی بدولت اس کو اسلام و کفر میں فاصل ٹھہرایا گیا ہے۔ یا تمام عبادات پر مقدم مانا گیا ہے۔ اور اس کے تارک کے لئے قتل کی سزا تجویز کی گئی ہے۔ حضورِ قلب اور مناجات و ذکر ایسی خصوصیات ہی کی وجہ سے یہ دین کا اہم ستون بھی ہے۔ ورنہ صرف اعمال ظاہری اور حرکات جسمانی کو یہ شرف کہاں حاصل۔ کہ اس کے ساتھ ایسی اہمیتیں وابستہ ہوں۔ اس پر ممکن ہے کہ کوئی یہ کہدے کہ حضورِ قلب کو نماز کے لئے شرط ٹھہرانا اور یہ کہنا کہ اس کے بغیر نماز مقبول ہی نہیں ہوتی تمام فقہاء کے مسلک کے خلاف ہے۔ کیونکہ وہ تو حضورِ قلب کو صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ضروری خیال کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس کیفیت کا پوری نماز میں قائم رہنا ان کے نزدیک صحت صلوٰۃ کے لئے ضروری نہیں۔

اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ فقہاء کے منصب کے بارہ میں یہ واضح ہے کہ یہ حضرات باطن امور سے تعرض نہیں کرتے، نہ دلوں کو چیر پھاڑ کے دیکھتے ہیں۔ اور نہ طریق آخرت ان کا نصب العین ہی ہوتا ہے، انہیں تو ظاہر سے غرض ہے، اور اس پر ظاہر یہ احکام و مسائل کی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ یہ انداز استدلال معاملات میں تو حق بجانب مانا جا سکتا ہے۔ اور قتل و تعزیر سلطانی کے حق میں تو اس سے بلاشبہ مدد مل سکتی ہے۔ لیکن ابواب آخرت میں یہ طریق چلنے والا نہیں۔ عبادات میں تو لامحالہ دلوں کو دیکھا جائے گا اور نیت و قصد اور حضورِ قلب کے داعیات کا جائزہ لیا جائیگا پھر یہ کہنا بھی علی الاطلاق درست نہیں کہ اس پر فقہاء کا اجماع ہے۔ کیونکہ قدماء سے اس کے خلاف بھی منقول ہے۔ بشیر بن حارث کہتے ہیں :

من لم یخشع فسدت صلاتہ۔ — جو نماز میں خشوع پیدا نہیں کرتا ہم اس کی نماز فاسد ہے

حضرت حسن سے مروی ہے:

کل صلاۃ لا یحضر فیہا القلب فہی الی العقوبۃ اسرع۔ — جس نماز میں دل حاضر نہیں ہے، وہ تو ثواب کے بجائے عقوبت کی زیادہ مستحق ہے۔

جناب معاذ بن جبل کا کہنا ہے:

من عرف من علی یمینہ وشمالہ متعمداً وھو فی الصلوٰۃ فلا صلوٰۃ لہٗ۔ — نماز میں جو شخص یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے دائیں بائیں کون کون لوگ کھڑے ہیں اس کی نماز نہیں ہوتی۔

حضرت معاذ سے اس معنی کی ایک حدیث بھی مروی ہے:

ان العبد یصلی الصلاۃ لا یکتب لہ سدسہا ولا عشرہا وانما یکتب للعبد من صلاتہ ما عقل منہا۔ — ایک بندہ جب نماز پڑھتا ہے تو سدس اور عشر کے حساب سے اس کا اجر مترتب نہیں ہوتا۔ بلکہ اس حساب سے مترتب ہوتا ہے کہ اس نے کتنی نماز سوچ سمجھ کر ادا کی۔

یہی نہیں عبدالواحد بن زید سے تو اس پر اجماع منقول ہے۔ اور وہ فقہاء جن کا حصّہ زہد و ورع میں بھی برابر کا ہے۔ اور وہ علماء جنہیں علماء آخرت کہنا چاہیئے ان سے کثرت سے ایسے اقوال کی روایت ہوئی ہے کہ جن سے نماز میں قصد و ارادہ اور حضورِ قلب کی اہمیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہاں مقام فتوی کی بات دوسری ہے۔ یہاں تکلیف ظاہری ہی پیش نظر رہتی ہے اور اس میں بھی یہ اصول ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ کہ یہ تکلیف اس حساب سے متعین ہو کہ عوام کم سے کم کس درجہ کی پابندی کا انتظام کر سکتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے سب لوگوں کو اس بات کا مکلف نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ کہ وہ حضورِ قلب کی کیفیتوں کو پوری نماز میں قائم رکھیں کیونکہ ایسا کرنا تو صرف چند ہی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے لہٰذا ان کے لئے یہ رعایت رکھی گئی کہ یہ اس کو قائم رکھیں۔ چاہے ایک لمحہ کے لئے ہی سہی، یعنی تکبیر تحریمہ کے وقت ہم ایسے حضرات کے بارہ میں یہ خیال نہیں رکھتے، کہ ان کی وہی حیثیت ہے جو تارک صلوٰۃ کی ہے۔ کیونکہ انہوں نے نماز بہرحال ادا تو کی ہے۔ اور حضورِ قلب کی پابندی کو قبول تو کیا ہے اگرچہ پل بھر کے لئے۔ مگر ایک پہلو اس میں خطرے کا بھی ہے جو معمولی نہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک شخص جسے خدمتِ شاہی میں حاضر باش رہنے کا حکم ہے۔ اگر اس طریق سے حاضری دیتا ہے۔ کہ جس سے اس عہدہ کی توہین ہوتی ہے، عدم اعتناء ٹپکتا ہے۔ وہ یہ معلوم کرتا ہے کہ خدمت کی بجائے یہ ادنیٰ تر اور حقیر تر مشاغل میں مصروف رہتا ہے۔ تو اس کی حالت اس شخص کے مقابلہ میں زیادہ سنگین ہے جو سرے سے خدمت کی ذمہ داریوں کو قبول ہی نہیں کرتا۔

علاوہ ازیں یہ نکتہ بھی لائق صد توجہ ہے کہ حضورِ قلب نماز کی روح اور عطر ہے۔ یہ جس مقدار میں بھی پایا

جائے گا اسی نسبت سے نماز کی زندگی اور حیات کی تعیین ہو سکے گی۔ اور جس نسبت سے اس سے کوئی شخص محروم ہوگا ـــــ اسی نسبت سے گویا اس کی نماز میں زندگی کے آثار و علائم کی کمی ہوگی۔ پھر جس طرح جسمانی زندگی کا تصور ہمارے نزدیک یہ نہیں ہے کہ ایک شخص زندہ تو ہو مگر چل پھر نہ سکے، اور ایک لاشے کی طرح خود اپنے ہی لئے ایک قسم کا بار ہو۔ اسی طرح عبادات میں ایسی بے کیف اور بے جان نمازیں کس مصرف کی ہیں، کہ جن میں روح اور زندگی کی نشاط انگیزیاں یکسر مفقود ہوں۔

وہ کیا باطنی کیفیتیں ہیں جن سے نماز کی تکمیل ہوتی ہے

قرآن و حدیث پر غور کیجئے تو ان معانی اور کیفیات پر کثرت سے آیات و حدیث ملیں گی۔ جو نماز کی روح کو چمکاتی اور سنوارتی ہیں۔ مگر ان سب کا استیعاب ان چھ باتوں میں ہو جاتا ہے۔ حضور قلب۔ تفہیم۔ تعظیم۔ ہیبت۔ رجا اور حیا۔

۱۔ حضور قلب سے ہماری مراد یہ ہے۔ کہ دل جن معانی و کیفیات سے دورانِ نماز میں دوچار ہے ان کے علاوہ تمام جذبات اور خواہشات سے خالی ہو جائے، اور ایسا معلوم ہو کہ زبان سے جو کلمات جاری ہیں دل میں انہیں معانی کا ہجوم و فور ہے۔

۲۔ تفہیم اس سے آگے کی ایک منزل کا نام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام و معنی کے ساتھ اس کے مقتضیات کا احساس بھی دل میں موجزن ہو۔ اور یہ وہ مقام ہے جس میں کہ استعداد کے اختلاف سے لوگوں میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ کیونکہ ہر شخص میں فہم قرآن کا ذوق یکساں نہیں۔ کسی کسی کو تو نماز میں ایسے ایسے لطائف و نوادر سوجھتے ہیں، کہ جو عموماً نہیں سوجھتے ہیں۔ اور یہ جو قرآنِ حکیم میں آیا ہے کہ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر۔ تو وہ تفہیم قرآن ہی کا تقاضہ ہے کہ انسان برائیوں سے دست بردار ہونے کا تہیہ کر لیتا ہے۔

۳۔ تعظیم۔ ان دونوں کیفیتوں سے جداگانہ ایک کیفیت سے تعبیر ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک شخص اپنے آقا سے مخاطب ہو۔ اس کا دل حاضر ہو اور یہ بھی سمجھ رہا ہو کہ اس کی زبان سے کن کلمات کا اظہار ہو رہا ہے۔ تاہم اس کا دل عظمت و احترام کے جذبات سے عاری ہو۔ نماز میں تعظیم یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے لئے حضورِ قلب اور تفہیم کے ساتھ ساتھ اللہ کے لئے اکرام و کبریائی کا احساس بھی پایا جائے۔

۴۔ ہیبت یہ ہے کہ نمازی دل میں خوف و خشیت کے جذبات کی فراوانیوں کو محسوس کرے۔ خوف و خشیت کے بارہ میں یہ سمجھ رکھنا چاہئے۔ کہ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ ہے جس کا تعلق اسبابِ خسیسہ سے ہے۔ مثلاً کوئی شخص سانپ اور بچھو سے دہشت زدہ ہو۔ یا کوئی شخص کسی کی کج خلقی و کج ادائی سے خائف ہو۔ دوسرے وہ جس کا سرچشمہ اجلال و احترام ہے، یہاں یہ دوسری قسم مراد ہے۔

۵۔ رجاء۔ کا یہ معنی ہے کہ نمازی تعظیم و ہیبت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالےٰ سے حقِ اطاعت پر ثواب و اجر کی توقع

بھی رکھے، اور اس حقیقت پر بھی یقین رکھے کہ نافرمانی پر سزا و عقوبت کا لامحالہ سامنا کرنا پڑے گا۔

۶۔ حیا سے یہ غرض ہے کہ انسان کے دل میں عبادات کے دوران میں تقصیر و کوتاہی اور عجز و ندامت کے اثرات برابر محسوس کرتا ہے۔ اور کسی وقت بھی یہ خیال نہ کرے کہ اس نے کما حقہٗ بندگی و اطاعت کے تقاضوں کو پورا کر لیا ہے۔

یہ تو ہوئیں وہ باطنی کیفیتیں اور لطائف جس سے کہ نماز کی روح نکھرتی اور مجلا ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان کیفیات کے حصول کا طریق کیا ہے؟ طریق زیادہ پیچیدہ نہیں۔ مثلاً حضور قلب کی نعمت سے مالا مال ہونا ہو تو اس راز کو معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ دل کی توجہات کا محور و مدار کون چیز ہے اور وہ کیا شے ہے جس کی اس تک باگیں مڑتی ہیں۔ کیونکہ دل کی فطرت یہ ہے کہ اگر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف راجع نہیں ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ اب یہ ساکن ہے اور اس کی حرکات و توجہات کا کوئی مرکز ہی نہیں رہا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے امور دنیا کو اپنا مطلوب قرار دے لیا ہے۔ لہٰذا اس مرحلہ پر انسان کو چاہیئے، کہ وہ دل میں اس حقیقت کو اُتارنے کی کوشش کرے، کہ زندگی کا ماحصل آخرت ہے دنیا اور امور دنیا کا نہیں۔ اور آخرت کی نعمتیں اس وقت تک حاصل ہونے والی نہیں جب تک بندگی و اطاعت کا نفس کو عادی نہ بنایا جائے۔ جب اس طرح کی کیفیتوں کو بار بار دل میں بٹھایا جائے گا، تو اس کا بحیثیت مجموعی یہ اثر ہوگا کہ دل حضور کی لذتوں سے بہرہ یاب ہونے لگیگا۔

اسی طرح تفہیم کی عادت ڈالنے کے لئے ضروری ہے کہ قلب کو معانی و لطافت قرآنی سے آشنا رکھنے کی سعی جاری رکھے۔ اور اس سلسلہ میں جو جو جذبات حائل نظر آئیں ان کے استیصال پر کمر ہمت باندھے اور پوری قوتِ فکری اور دلجمعی سے ان کا مقابلہ کرے۔ اس باب میں اصل نکتہ یہ ہے کہ جس نسبت سے اس محبوب حقیقی سے شغف و عشق اور تعلق خاطر ہوگا اسی نسبت سے اس کے ذکر اور یاد میں دل لطف محسوس کریگا۔ اور اس کے امر و نہی کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرے گا۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ تعلق باللہ کا رشتہ استوار ہو۔ کہ اس سے یہ سب نعمتیں آپ سے آپ حاصل ہو جائیں گی۔

تعظیم دل میں علم کی دو کیفیتیں پیدا کرنے سے اُبھرتی ہے۔ پہلی کیفیت جس کو پیدا کرنا مقصود ہے یہ ہے کہ دل میں اجلال الٰہی کے داعی کو بیدار کیا جائے۔ اور اس کی عظمت و توقیر کے نقوش کو مرتسم کیا جائے۔ کیونکہ یہی ایمان کی جڑ ہے۔ دوسرے اپنے نفس کے بارہ میں یہ رائے قائم کی جائے، کہ یہ حد درجہ حقیر ہے۔ اپنے متعلق اس طرح سوچا جائے کہ اللہ تعالےٰ کی ذات گرامی ہی نے اس مرتبہ انسانیت پر پہنچایا ہے، اور اسی کی مہربانیوں اور عنایتوں سے یہ اس منصب رفیع تک پہنچا ہے۔ علم کی یہ دو نعمتیں ایسی ہیں کہ ان کے احضار سے انشاء اللہ خشوع و خضوع اور استکانۃ و انکسار کے جذبات خود بخود لوحِ قلب پر نمایاں ہونگے۔

ہیبت وخوف کے جذبے اس وقت دل میں جاگزیں ہوں گے جب یہ یقین راسخ ہو جائے گا کہ یہ سارا کارخانہ قدرت اپنی محکمیوں اور استواریوں کے باوجود محض اللہ تعالےٰ کی مرضی پر قائم ہے۔ اسی کی قدرت و سطوت کا یہ کرشمہ ہے کہ اس نے ایک مادہ سے یہ عالم ہست وبود پیدا کر دکھایا ہے۔ اور وہ ایسا مستغنی ہے کہ اگر چاہے تو اس پورے عالم رنگ و بو کو ایک پل میں فنا کے گھاٹ اتار دے۔ اور اس پر بھی اس کی بادشاہت اور صفات جلال میں ذرہ برابر کمی واقع نہ ہو۔ اس کے علاوہ اس حقیقت پر بھی غور کرنا چاہیئے۔ کہ انبیاء علوم اسلام اور بڑے بڑے اولیاء کرام اپنی بزرگی اور درجہ محبوبیت کے ہوتے ہوئے بھی۔ اس دنیا میں کتنے آلام ومصائب میں گھرے رہتے ہیں۔ حالانکہ اگر اللہ تعالےٰ کو منظور ہو تو ان کا بال بھی بیکا نہیں ہو سکتا اور وہ یہاں مزے سے ادنیٰ اذیت برداشت کئے بغیر بھی رہ سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ارادہ ومشیت کے سامنے دم مارنے کی گنجائش نہیں۔

رجاء وامید کے ولولے اس طریق سے انسان کے دل میں پائے جا سکتے ہیں۔ کہ اس کی نظر اس کے بے اندازہ لطف وکرم پر ہو۔ اس کی گوناگوں عنائتوں اور بخششوں پر ہو۔ اور اس کے دل میں یقین واذعان یہ پہلو کروٹ بدلے کہ دیکھو اللہ نے کس مہربانی سے ہمارے اعمال پر ہمیں جنت کے صلہ سے نوازنے کا وعدہ فرمایا ہے، حالانکہ صلہ و انعام کی یہ صورت کیا کم تھی کہ ہم جب تک دنیا میں رہے، نیکی اور پاکبازی کی وجہ سے امن اور چین سے رہے۔

حیاء کی تخلیق اس احساس کے بیدار کرنے سے ہوتی ہے۔ کہ اس کے فضل وکرم کے مقابلہ میں اپنی عبادات کے طول وعرض کا جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ یہ کس درجہ بے مایہ ہیں۔ نفس وقلب کے نقائص وعیوب کو نظروفکر کے سامنے لایا جائے۔ کہ ان میں اخلاص کی مقدار کتنی کم ہے۔ اور برائی اور شر کی طرف ان کے میلان اور رغبت کا کیا عالم ہے! اور کس تیزی سے یہ نفع عاجل کی طرف لپکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالےٰ کے علم کی ہمہ گیریوں پر بھی نگاہ رہنا چاہیئے۔ اور یہ ماننا چاہیئے، کہ وہ ہمارے مخفیات قلب خطرات وساوس سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ اور دل کی دھڑکنوں تک سے واقف ہے۔ اس انداز فکر سے انسان حیاء کی نعمت سے انسان بہرہ مند ہو سکتا ہے۔

غرض ان لطائف باطن کو ابھارنا اور پیدا کرنا ممکن اور سہل ہے، بشرطیکہ ان کے اسباب وعلل کو ایک نظر دیکھ لیا جائے، اور پھر قصد وہمت سے ان اسباب وعلل کو دور کرنے کی مخلصانہ کوشش کی جائے۔ ان سب کا دراصل تعلق ایمان ونفس کی جاں بخش کیفیتوں سے ہے۔ اگر یہ لطیفہ بیدار ہو گیا۔ اور شک وشبہ کی خلشیں دور ہو گئیں۔ تو پھر باطنی و نفسی زندگی گویا خود بخود اصلاح پذیر ہو گئی۔ اس خصوص میں ایمان اصل شے ہے۔ اگر یہ جلوہ ریز ہے۔ تو خشوع و خضوع اور اخلاص واحسان سب کچھ ہے اور یہی نہیں تو کچھ بھی نہیں۔